'شہر سوختہ': ایک تجزیہ

ڈاکٹر مظہر احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، ذاکر حسین، دہلی کالج (شبینہ)، موبائل:9212089910

عشرت ظفر اپنے عہد کے ایسے ناول نگار ہیں، جو تاریخی اور تہذیبی شعور رکھتے ہیں اور معاشرے میں پیدا ہونے والے درد وغم کو ایسے کرداروں کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو ہمیں اپنے اِرد گرد ہی محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اُن کرداروں میں معاشرے کی نبض کو ٹٹولتے ہیں۔ یہی اُن کی انفرادیت ہے۔

ناول 'شہر سوختہ' داخلیت و خارجیت کے امتزاج سے مزین ایک خودکلامی ہے جسے واحد متکلم نے 'ہم کلامی' بھی کہا ہے۔ چنانچہ قاری پہلی نظر میں اسے 'سوانحی خودکلامی' کہہ سکتا ہے، مگر اس خودکلامی کے پس منظر میں واحد متکلم نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔ چنانچہ شہر سوختہ کا ماتم دار رقمطراز ہے کہ:

''ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی یہ داستان جس میں مستقبل کے اشارے بھی پنہاں ہیں۔ میرے شہر سوختہ کا ایک حوالہ تو ہے ہی لیکن اس میں کئی گمشدہ و برباد شہروں کے مناظر بھی، ہیں یہ ایک خون آلود جسم ہے۔ ہر چند کہ یہ افسانہ میری عمر بے مروت کے دائروں میں قید ہے، لیکن خونچکانی کا عمل جاری ہے۔''

شہر سوختہ دراصل 'ماضی' ہے کہ جواب ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے بلکہ اسے مٹایا جا چکا ہے، جلایا جا چکا ہے اور واحد متکلم اس کے جلے ہوئے آثاروں پر بیٹھا ہوا نوحہ خوانی کر رہا ہے۔ چنانچہ تقریباً ہر ذیلی داستان کی ابتدا میں یہ داخلی جملے واحد متکلم کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر بکھرتے چلے جاتے ہیں:

''میں شہر سوختہ کا ماتم دار.....''

''میں شہر سوختہ کا نوحہ خواں.....''

''مجھے اپنے جلے ہوئے شہر کی خاکستر.....''

''وہ شہر سوختہ جس کے جلتے ہوئے مناظر میری طاق بینائی میں چراغوں کی طرح روشن ہیں.....''

''شہر جل کر راکھ ہو چکا ہے.....''

''میرا شہر جل کر راکھ ہو چکا ہے.....'' وغیرہ وغیرہ۔ ان جملوں کے تسلسل و تواتر سے ناول کے اجتماعی ماحول پر غم واندوہ اور داخلیت کی ایک دبیز چادر سی تنی ہوئی ہے اور واحد متکلم اسی داخلیت کے پس منظر میں اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے شہر کی کہانی کبھی خودکلامی کے انداز میں اور کبھی واعظانہ اندازِ تحریر کے ذریعے بیان کرتا جاتا ہے۔

ناول کے مجموعی ماحول پر غم واندوہ کی ایک چادر سی پڑی ہوئی ہے۔ مصنف ایک بھرپور و توانا زندگی گزارنے کے بعد بھی غم کے ایک اتھاہ ساگر میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ مصنف کا یہ غم ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی ہے کہ وہ انسانیت پر جاری ظلم وستم کی داستانیں بھی بیان کرتا جاتا ہے یعنی ذاتی غم کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کے اثرات بھی واحد متکلم کے شہر کو سوختہ کرنے کے درپے ہیں۔ تقسیمِ وطن، فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی منافرت، تہذیبی شکستگی اور تاریخی بدحالی کی داستانوں سے پُر یہ ناول داخلیت و خارجیت کا عمدہ امتزاج ہے اور عہدِ رفتہ کی عظیم نشانیوں کے مسمار کیے جانے کے غم سے بھی اس کا واسطہ ہے۔ ناول کے ابتدائی صفحات میں مصنف اپنی زندگی کے خارجی حالات و واقعات کو سرسری طور پر بیان کرتا ہے والدین اور بھائی بہنوں کی تفصیلات بھی یہاں موجود ہیں۔ والدہ سے متعلق معلومات میں واحد متکلم کا قلم قدرے جذباتی ہو جاتا ہے اور وہ فارسی زبان سے اپنی ذہنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے والدہ کی یادیں بھی تازہ کر دیتا ہے:

''فارسی میری مادری زبان کی طرح ہے اور مجھے جو بھی سلیقہ حاصل ہے وہ اسی کی عطا ہے .....میں اپنی مادرِ مہربان کی شفقت و رفاقت کے ٹھنڈے اور گھنیرے سائے میں بہت کم رہا لیکن وہاں سے جو کچھ مجھے ملا ہے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے اور متاعِ آگہی کا ایک ایسا شہر آراستہ

ہے جو میرے اندر سانسیں لیتا رہتا ہے۔''

واحد متکلم کے لیے لکھنا، ماضی حال اور مستقبل، تینوں جہان کی سیر کے مترادف ہے اور یہی اس کا محور و مرکز ہے۔ خود کلامی کے ساتھ ساتھ مصنف خارجی حالات کی طرف بھی رجوع کرتا ہے اور بیشتر اس کی یہ خود کلامی دراصل اسی خارجیت کا ردِعمل ہوتی ہے۔ چنانچہ خارجی واقعات جو واحد متکلم ہی کیا، کسی بھی حساس وجود کے لیے مقامِ عبرت کے پہلو بہ پہلو اسے اپنی ہی ذات میں گم کر دینے کے لیے کافی ہیں، مصنف کی داخلیت کی وجہ بنے ہیں۔ بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی چند برسوں میں انسانی تاریخ نے ظلم و تشدد اور بربریت کے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ پتھر دل انسان بھی پگھل کر رہ جائے۔ واحد متکلم بھی ایسے ہی خارجی حالات سے متاثر ہوا ہے:

''میں نے بغداد پر بموں اور میزائلوں کی بارش بھی دیکھی جس نے الف لیلوی شہر کو غارت کیا اور کھنڈر بنا دیا۔ ہلاکو کی میراث کے امانت دار نے اس شہر کی سرزمین کو انسانی خون سے نہلا دیا۔ میں نے افغانستان میں فواکہات کے باغوں کو آتش کدوں سے ہم آغوش ہوتے ہوئے دیکھا، جہاں انسانی جسم جلے پڑے تھے اور بے گور و کفن تھے۔ میں نے کشمیر اور گجرات کو انسانی خون میں غسل کرتے ہوئے دیکھا، جہاں سیاست کے قمار خانوں کے شاطر چالیں چل رہے تھے۔''

ان ہی اندرونی اور بیرونی واقعات نے واحد متکلم کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ''انسان کے مزاج میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی وہ اسی طرح غیر مہذب ہے۔'' اور پھر ایسے خوں ریز واقعات مصنف کے ذہن میں ایسی ہیبت ناکی پیدا کر دیتے ہیں کہ ذہن کی اسکرین پر ایسی تصویریں ابھرتی ہیں۔ ''جلتے ہوئے شہر، بکھری ہوئی لاشیں، تڑپتے ہوئے زخمی لوگ، بلکتے ہوئے بچے، خوف و دہشت سے گونگی عورتیں، لہولہان شرم گاہوں کو خون آلود ہتھیلیوں سے چھپائے ہوئے۔''

سانحۂ بابری مسجد جدید ہندستان کی تاریخ کا ایک تاریک اور خوفناک باب ہے جس نے ہر حساس ہندستانی کے ذہن و دل کو متاثر کیا۔ مصنف بھی اس کی انہدامی کارروائی سے بے طرح متاثر ہوا اور اسی خارجی واقعہ نے اس کی زندگی کو ایک اتھاہ داخلی کیفیت سے دوچار کر دیا:

''اس منہدم عمارت کے خدوخال کبھی میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکتے، جس کی پرشکوہ تعمیر کا منظر میرے آبا و اجداد نے دیکھا، آخری سانس تک اسے یاد رکھا تھا۔ اسی طرح میں بھی اس عمارت کے خدوخال کو نہ بھلا سکوں گا اور نہ اس منظر کو جس میں وہ تمام پرشکوہ خال و خد ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے تھے کیونکہ اس کے اوپر پڑنے والے بیلچوں اور کدالوں سے نہ صرف اس کے وجود کو مسخ کیا تھا بلکہ میرے اندر بھی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا کہ میں اب ان منتشر ٹکڑوں کو سمیٹنے کا کام بھی شب و روز کرتا رہتا ہوں۔''

یہ سانحہ مصنف کو قنوطیت اور نا اُمیدی کی دنیا میں لے جاتا ہے اور وہ یہ کہنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

''میں اس عمارت کے ملبے کے پاس بیٹھا ہوں، میرے چاروں طرف خشت ریزے ہیں۔ جن کے قلوب میں صدیوں پرانی تہذیب ایک زخمی بچے کی طرح سسک رہی ہے۔''

شہر سوختہ واحد متکلم کے ارمانوں اور خوابوں کا شہر ہے جسے بے درد اور ظالم دنیا نے فنا کر دیا ہے اور واحد متکلم اس کی راکھ پر بیٹھا ماضی و حال کی قصہ گوئی میں مصروف ہے۔ یہ دراصل ایک شہر آشوب ہے مگر اس کا کینوس قدرے وسیع ہے ظاہر و باطن کی تمناؤں اور آرزوؤں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ دنیا کی تباہی کے مناظر بھی یہاں جلوہ افروز ہیں۔ شہر سوختہ کا ماتم دار غمِ ذات کی پیچیدگیوں ہی میں غلطاں و پیچاں نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر برپا شکست و ریخت بھی اس کا موضوع ہے اس کے غم کی کائنات نہایت وسیع ہے اور یوں تمام دنیا کا درد اس کا درد بن گیا ہے۔ سامراجی قوتوں کی بالادستی، مکر و فریب سے آراستہ حکمتِ عملی اور زیردستوں کی مظلومیت بھی اس کے دائرے میں آ گئی ہے۔ وہ ظلم کو پھلتا پھولتا دیکھتا ہے مگر بے بس ہے۔ وہ اپنی بے چارگی پر کڑھتا ہے اور اس کی یہ بے چارگی ایک چیخ بن جاتی ہے۔ وہ عہدِ حاضر کے چنگیز خانوں پر انگشت نمائی کرتا ہے۔ انھیں بے نقاب کرتا ہے اور ان کے ظلم و جبر کے خلاف ایک نعرۂ مستانہ لگاتا ہے۔ امریکی ظلم و استبداد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے اخطبوط کے تلمیحی استعارے کا استعمال کیا ہے :

''اخطبوط اپنی ہر آنکھ کرۂ ارض کے گوشوں پر مرکوز کیے ہوئے ہے۔ اس کی سیکڑوں آنکھیں ہمہ وقت کھلی رہتی ہیں..... اخطبوط ایک شاطر عیار ہے۔ یہ عیاری اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی ہے..... حملہ کرنا اور انسانی خون پینا اس کی سرشت کا ایک حصّہ ہے..... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نے اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کیا کیا چالیں چلی ہیں، کس

طرح ان جزیروں پر بھی قبضہ کرلیا ہے جو کسی کی ملکیت نہیں تھے اور جنّتِ ارضی کہلاتے تھے۔ وہ آج اس کی سلطنت میں شامل ہیں کیونکہ توسیعِ سلطنت کا اسے بے حد شوق ہے۔''

شہر تہذیب و تمدن کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ خوف و دہشت اور تشدد کی آماجگاہ بھی ہیں اور اسی لیے آج کی مہذب دنیا میں شہر جنگل راج کا نمونہ بن گئے ہیں۔ دہشت گردی، جنگ و جدال اور سامراجی بالادستی نے انسانی زندگیوں کو تلف کردیا ہے۔ بقول شاعر:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

مصنف کا شہر بھی جلا دیا گیا ہے۔ مگر اس کا شہر اس کے باطن میں زندہ ہے:

''میرا شہر بھی جلا دیا گیا ہے لیکن شہر میرے اندر زندہ ہے۔ بادی النظر میں میں ایک راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوں لیکن میرے وجود کے اندر میرا شہر لہلہا رہا ہے۔''

انسانیت پر ظلم و ستم کبھی مذہب و ملت کے نام پر تو کبھی نسلی تعصب و علاقائی عصبیت کے نام پر جاری ہے اور اس کا نشانہ وہ تمام شہر ہیں جہاں انسان اپنی تمام تر ترقیوں، جس میں ذہنی بالیدگی بھی شامل ہے، سکونت پذیر ہے اور یہی واحد متکلم کا گریہ ہے کہ ایسے ہی کسی شہر کے ظاہر و باطن سے اس کا بھی رشتہ قائم ہے۔

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

پورے ناول پر ایک فلسفیانہ سوچ کی دبیز چادر سی پڑی ہوئی ہے جو شہر سوختہ اور اس کے متعلقات سے بھی وابستہ ہے اور واحد متکلم کی ذاتی و صفاتی زندگی کی بھی پروردہ ہے۔ ماضی حال اور مستقبل کی زمانی کشمکش بھی اس میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ خارجیت سے داخلیت کی طرف مراجعت ہی انسان کا مقدر ہے کہ نام نہاد ترقی نے انسان کی زیست اس کرۂ ارض پر مشکل سے مشکل تر کردی ہے۔ ماحولیاتی کثافت نے اس کرۂ ارض کو ایک عظیم شہر سوختہ میں تبدیل کردیا ہے۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ کرۂ ارض انتہائی تیزی کے ساتھ ایک جہنم زار میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ تمازت بڑھ رہی ہے۔ شاید سورج سوا نیزے کی طرف سفر کرنے کی پیش رفت کر چکا ہے..... عظیم برف پارے یعنی گلیشیئر اپنا وجود کھو رہے ہیں۔ تباہی کا یہ کون سا لمحہ ہے جو ظلمت و نور کے بے کنار دیاروں، بے کراں خلاؤں میں اس کی آنکھ مچولی کے درمیان محوِ پرواز.... کرۂ ارض پر بود و باش رکھنے والوں کو یہ رائے بھی دی گئی ہے کہ وہ کسی اور سیارے میں چلے جائیں۔ زمین کی ماحولیاتی کثافت اب ان کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔''

ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہوئے واحد متکلم اپنی رومانی زندگی کے نشیب و فراز کی طرف بھی نظر دوڑاتا ہے۔ حسن کی دیوی وینس (زہرہ) سے مصنف کی دلچسپی اور قربت اس کی رومانوی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے واحد متکلم حسن و عشق کی سرمستیوں میں ڈوب جاتا ہے اور پھر اس رومان کے خاتمے کا المناک منظر پیش کرتے ہوئے ناول کے نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے کہ وقت کے ظالم ہاتھوں نے اس کے ارمانوں کے شہر کو ہی سوختہ نہیں کیا بلکہ نرم و نازک جذباتِ عشق و محبت اور حسن کی دیوی کو بھی ختم کردیا ہے۔ چنانچہ حقیقت کی سنگلاخ زمین پر شہر سوختہ کی آگ نے انسان کی روح اور اس کے رومان اور اس کی پاکیزگی کو بھی ختم کردیا ہے، مگر واحد متکلم محبت کے اس لازوال وجود کو بچانے کے لیے سرگرداں ہے اور نہایت انہماک سے وینس (زہرہ) کے جسم کی رکھوالی کر رہا ہے۔ محبت فنا ہو چکی ہے مگر اس کا جسم موجود ہے اور واحد متکلم اب اس کا محافظ ہے۔

''میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا جس کے ریشمی گیسوؤں کی ہرلٹ کی زیریں تہوں میں خوشبو کے سرمائے سے مالا مال لہریں بہہ رہی تھیں۔ اکثر وہ رات کی سیاہ جھیل میں اپنی کھنکتی ہوئی آواز کے ترشے ہوئے پیکروں کو اذنِ غرقابی دے کر میری آنکھوں کے لیے طرح طرح کے نقرئی، چمپئی، قرمزی مناظر فراہم کرتی ہے..... وہ خطوطِ جسم جو رگِ جاں سے زیادہ نازک اور بے بہا قلمکاریوں کا نمونہ ہیں..... میری آنکھیں اس طلسم کی سیر کرتی رہی ہیں، انھیں چھوتی رہی ہیں، انھیں چومتی رہی ہیں اور انھیں سجدہ کرتی رہی ہیں۔''

زندگی کے جبرِ مسلسل کی کہانی بیان کرتے ہوئے واحد متکلم وقت کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ وقت انسان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھا اور انسان کے عدم وجود کے بعد بھی رہے گا۔ لہٰذا انسان وقت کا پابند ہے، وقت انسان کا پابند نہیں۔ اور وقت کا یہی تحرک ایک نئی اور بہتر کائنات کی تخلیق کا سبب بنے گا اور نیا انسان وجود میں آئے گا۔ اپنی تمام تر مایوسیوں اور ناتمامیوں کے باوجود واحد متکلم مستقبل سے بیزار نہیں اور ایک رجائی انداز میں ناول کو اختتام سے دوچار کرتا ہے

-

''جب انسان زمین پر نہیں تھا تب بھی وقت متحرک تھا اور جب انسان اس زمین پر نہیں رہے گا اس عالم میں بھی وقت متحرک رہے گا۔ کیونکہ انسان وقت کا پابند ہے۔ وقت انسان کا پابند نہیں اور یہ کہ وقت کبھی جامد نہیں ہوگا۔ وقت کے اسی تسلسل اور تحرک سے ایک نئی کائنات جنم لے گی۔''

ناول کے ماحول پر داخلیت حاوی نظر آتی ہے مگر کبھی کبھی ناول خود کلامی کے اسلوب سے نکل کر بیانیہ رخ اختیار کرتا ہے۔ یہاں خارجیت حاوی ہو جاتی ہے، ایسے حصے بامعنیٰ ہونے کے باوجود ناول کے مزاج سے دور جا پڑتے ہیں۔

ناول کی پوری فضا تلمیحات و تاریخی استعاروں سے مزین ہے اور ان کے استعمال میں مصنف کو ملکہ حاصل ہے۔ یونانی، ایرانی، اسلامی اور ہندی اساطیر و دیو مالا کے برمحل و برجستہ استعمال نے ناول کے ماحول کو دلچسپ اور بامعنیٰ بنا دیا ہے۔ یہ اساطیر بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کے پس منظر کو سمجھے بغیر ناول کے مافی الضمیر تک رسائی قدرے مشکل ہے۔

ناول میں لفظ 'آئینہ' بطور استعارہ و علامت استعمال کیا گیا ہے۔ آئینہ اور آئینے کے مختلف پہلوؤں کو برتتے ہوئے مصنف نے اسے ناول کے کلیدی لفظ کی حیثیت فراہم کر دی ہے۔ اس آئینے میں کبھی واحد متکلم اپنی شبیہ دیکھتا ہے اور کبھی گرد و پیش کی داخلی تصاویر اس آئینے میں اُبھرتی ہیں اور کبھی خارجی و دنیاوی تصاویر کا عکس اس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چند مثالیں:

''اس آئینے کی طرف دیکھو جس کے قلب میں ان مناظر کے عکسوں کا خزانہ موجود و محفوظ ہے۔ جو ابھی آفریدگی کی لذّت سے آشنا اور ہم آغوش نہیں ہو سکے ہیں۔''

''معاً تاریک آئینے کے چہرے سے غبار کی دبیز چادر سمٹ گئی اور روشنی کا سمندر لہریں لینے لگا۔''

''میں جانتا ہوں کہ میں ایک طوطی کی طرح ہوں، جس کا قفس آئینہ ہے۔ میں جدھر بھی نگاہ کرتا ہوں مجھے اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔''

''پھر آرائشِ جمال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ایک حجاب ہوتا ہے، جس میں ایک آئینہ ہے۔ جس میں وہ عظیم قوت خود اپنے ہی جمال کے دیدار میں مصروف نظر آتی ہے۔''

زبان میں فکری بالیدگی کے ساتھ ساتھ شعریت بھی کارفرما ہے بلکہ اکثر مواقع پر اشعار نثر میں ضم کر دیے گئے ہیں۔ جس سے مصنف کی قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً

''ایک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا نظر آتا ہے۔''

''ہر چیز سرشارِ تمنا ہے اور میں ایک دل ہوں جسے سارے عالم سے لگا دیا گیا ہے۔''

''نہ بیمار پڑنے پر تیماردار کی ضرورت نہ مر جانے پر نوحہ خواں کی تلاش۔''

''میں آدمی ہوں ایک ایسا آدمی جس نے انسان بننے کی کوشش کی تھی۔''

''میری طبع رواں رکتی نہیں ہے، تھمتی نہیں ہے۔''

''دیدۂ و دل فرشِ راہ کیے۔''

''اور یہی عشرتِ قطرہ ہے کہ وہ اس دریا میں فنا ہو جائے۔''

واحد متکلم ناول کے اسلوب سے متعلق خود کہتا ہے کہ ''میں قصہ گوئی میں مصروف ہوں لیکن میری قصہ گوئی دوسروں سے مختلف ہے۔ میں اپنی قصہ گوئی میں آدمیوں اور چیزوں کی سچائی اور حقیقتوں پر پوری شدت سے دھیان مرکوز رکھتا ہوں۔'' مگر ناول میں کردار (آدمی) برائے نام ہیں اور 'چیزوں' سے زیادہ خیالات و احساسات اور خود کلامی کو ترجیح دی گئی ہے۔

فارسی اشعار کی پچّی کاری نے ناول کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ معنویت میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ناول کے اسلوب پر مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں بھی حاوی ہیں بطورِ خاص تصوف کی اصطلاحوں سے فضا آفرینی کی گئی ہے۔ فنا و بقا اور غمِ ذات و کائنات کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

غرض داخلیت و خارجیت کے امتزاج سے متصف یہ خود کلامی ایک ایسے شہر کا نوحہ ہے جسے ظالم سماج، سیاست اور اس کے متعلقات نے آگ کے حوالے کر دیا ہے اور وہ اس کے ملبے پر بیٹھا نوحہ خوانی کر رہا ہے۔ بقول احمد فراز

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

○○

○○